© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان کے ایک سرکاری جریدے میں جو ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے تحت شائع ہوتا ہے کسی صاحب کی طرف سے صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کے نام ایک مکتوبِ مفتوح شائع ہوا ہے جس میں پہلے تو مکتوب الیہ کی مدح و توصیف ہے، اس کے بعد اُن کے ذہن میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس ملک میں فتنوں کا اگر کوئی سرچشمہ ہے تو وہ دینی عناصر ہیں، پھر ان میں بھی خاص طور پر ایک خاص عنصر کو ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے اور صدر صاحب کو نہ صرف اس عنصر کے "عزائم" سے خبردار کیا گیا ہے بلکہ انہیں اس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس کے قلع قمع کرنے کی جلد از جلد فکر کریں۔

صدرِ مملکت اپنے اس "مشیر" اور "بہی خواہ" کے مشوروں کو کس حد تک درخورِ اعتناء سمجھتے ہیں، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر اس خط سے دلوں کی کدورت، اور دینی عناصر کے خلاف بغض و کینہ اور حسد و عداوت کی آگ، اور خاص طور پر جماعت اسلامی کے متعلق شدید نفرت و بیزاری اور اُسے نیست و نابود کر دینے کی خواہش اس خط کے ایک ایک لفظ سے جھلکتی ہے۔

اگر یہ محض ایک شخص کے خیالات ہوتے تو ہم قطعاً نوٹس نہ لیتے۔ مگر یہ "عام آدمی" جنہیں عوام کے قریب رہنے کا دعویٰ ہے، انہوں نے ایسی باتیں کی ہیں جو عوام کے دکھ درد، ان کی مشکلات، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا ترجمان ہونے کے بجائے ایک نہایت ہی مختصر سے مغرب زدہ طبقے کے خیالات کی ترجمان ہیں۔ مکتوب نگار اس بات کے دعویدار ہیں کہ وہ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ ایک عام آدمی کے مشاہدہ و مطالعہ کا نتیجہ ہے، جس کے ذہن پر کسی مخصوص سیاسی مسلک کا اثر نہیں، مگر جو باتیں انہوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارشاد فرمائی ہیں انہیں دیکھ کر اُن کے دعوے کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے۔ معلوم نہیں یہ صاحب عوام میں سادہ ذہن کے ساتھ کہاں گھومتے پھرے ہیں کہ انہیں عوام کی دینی عناصر کے خلاف نفرت کا علم ہوا؟ ہم نے تو عوام کو جہاں بھی دیکھا انہیں مغرب زدہ طبقے اور اسلام کے اندر اُس کی رخنہ اندازیوں کے خلاف شدید غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے پایا۔ بعض لوگوں کو دینی عناصر کے بعض افراد سے اختلاف ہو سکتا ہے، مگر دینی رہنمائی کے لیے عوام نے "ملّا" کو چھوڑ کر کبھی بھی "مسٹر" کی پیروی نہیں کی۔ "ملّا" جس کو دین سے بغض و عداوت رکھنے والے طبقوں نے بالکل ایک گالی بنا کر رکھ دیا ہے، آج بھی عوام کی توجہ کا مرکز ہے۔ وہ حلال کو حرام سے ممیّز کرنے کے لیے جائز و ناجائز کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے کے لیے، حق اور باطل کے مابین فرق کرنے کے لیے، عبادات اور معاملات میں شریعت کے احکام معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ "ملّا" ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسی کی بات پر اعتماد کرتے ہیں۔

دوسرے ممالک کو تو فی الحال نظر انداز کیجیے، صرف پاک و ہند میں جو نامور مسٹر پیدا ہوئے ہیں اُن کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالیے اور پھر دیکھیے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی امّت نے مفتی تسلیم کیا ہے؟ سر سیّد کو قوم سے جو محبت اور دین سے جو وابستگی تھی اُس سے کسے اختلاف ہو سکتا ہے۔ انہوں نے دین کی حمایت میں بعض قیمتی چیزیں بھی لکھیں اور امّت نے اُن کے کام کو سراہا بھی۔ مگر عقائد اور احکام کے کسی مسئلے میں بھی ان کا فتویٰ جاری نہ ہو سکا۔ سیّد امیر علی، مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک اپنی ساری فضیلت اور خدمات کے باوجود یہ مقام حاصل نہ کر سکے۔ ان کے کام کو جو لوگ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اُن کو بھی جب کسی معاملے میں اللہ اور اُس کے رسُول کا حکم معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنے ملک کے معروف علماءِ دین ہی کی طرف رجوع کیا۔ خالص دینی معاملات تو ایک طرف رہے، آپ کی یہ تحریکِ پاکستان بھی اُس وقت تک عوام میں مقبول نہ ہو سکی جب تک مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور اسی طرح کے دوسرے "ملاؤں" نے اس کے حق میں فتوے صادر نہ کیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ اقبالؒ کی روشن دماغی، ملت سے خیر خواہی، دینی بصیرت اور جدید تقاضوں کی سمجھ بوجھ میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں بھی کسی دینی مسئلے کے سمجھنے میں جب کوئی دقت پیش آتی ہے تو وہ سر راس مسعود، یا سر اکبر حیدری، یا خود قائد اعظم سے استفسار کرنے کے بجائے ملائی نظام کے ایک چشم و چراغ علامہ سید سلیمان ندویؒ پر اعتماد کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ ان "ملاؤں" کے کس قدر گرویدہ تھے اس کا اندازہ مکاتیب اقبالؒ سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

"ملا" کو ختم کرنے کے لیے حکومت کیا تدابیر اختیار کرتی ہے اور اس کے بہی خواہ اس کے سامنے کیا تجاویز پیش کرتے ہیں، ہمیں اس وقت اس سے کوئی بحث نہیں۔ ہم دیانتداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس خط میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ درحقیقت کسی عام آدمی کے احساسات نہیں بلکہ خود برسر اقتدار طبقوں کی خواہش الفاظ میں ڈھل کر قرطاس پر آ گئی ہے۔ اس مکتوب میں جتنی باتیں قلمبند کی گئی ہیں وہ سب وہی ہیں جو وقتاً فوقتاً ایوانِ اقتدار سے لب و لہجے کے فرق کے ساتھ کہی جاتی رہی ہیں۔ اس میں جو کچھ خوبی ہے وہ صرف یہ کہ یہ خط مغرب زدہ طبقے کے ہے جسے اس وقت دنیائے اسلام میں اقتدار بھی حاصل ہے، عزائم اور ارادوں کو پوری طرح بے نقاب کرتا ہے۔ خط کے تیور بھی یہ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ کسی عام آدمی کا انداز بیان نہیں ہو سکتا۔ اس کی زبان، اس کا اسلوبِ نگارش، اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ اس پردۂ زنگاری میں کوئی خاص شخصیت چھپی بیٹھی ہے۔ پھر اس میں جتنے مشورے بھی دیئے گئے ہیں وہ ایک خاص گروہ پہلے سے دیتا چلا آ رہا ہے۔ یہی مشورے لیاقت علی خاں مرحوم کو دیئے گئے، پھر اسی نوعیت کی گزارشات غلام محمد اور سکندر مرزا کی بارگاہ میں پیش کی گئیں، اور آج یہی معروضات محمد ایوب خاں صاحب کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں۔ ان مشوروں پر عملدرآمد ہوتا ہے یا نہیں، اور ان مشوروں پر عمل پیرا ہو کر بیچارے "ملا" کو کس حسرتناک انجام تک پہنچایا جاتا ہے، اس کے بارے میں کوئی بات بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ ہم تو صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتے ہیں کہ وہ مسلم ممالک کے برسر اقتدار طبقوں کو سمجھ بوجھ عطا کرے اور انہیں غلط

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشیروں کے فریب سے بچا لے۔ البتہ مسلمانوں کے سوچنے سمجھنے والے حلقوں کی خدمت میں ہم چند باتیں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ ان پر غور کریں۔

پہلی بات جس پر انہیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ یہ نہایت ہی مختصر سا مغرب زدہ طبقہ آخر "ملا" کے درپے آزار کیوں ہے؟ اس خط میں جس سبب کی نشاندہی کی گئی ہے وہی درحقیقت اصل پریشانی ہے جو اس طبقے کو کھائے جا رہی ہے۔ "ملا" ان لوگوں کے نزدیک "ہر ضروری اور مفید پروگرام اور تجویز کو غیر شرعی اور غیر اسلامی قرار دے کر عوام کو اس کے خلاف اکساتا ہے"۔ اپنے اس دعوے کی تائید میں خاندانی منصوبہ بندی اور "عائلی اصلاحات" کی ناکامی کو پیش کیا گیا ہے۔

پریشانی کی دوسری وجہ "ملا" کا معاشرے میں غیر معمولی اثر و رسوخ ہے۔ مکتوب نگار کو یہ صدمہ لاحق ہے کہ ہمارے علماء اور ائمہ اور خطباء کا عوام سے براہِ راست تعلق ہے۔ بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے اور معمولی دیہات تک مساجد کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہر قریہ اور بستی اور اس کا ہر محلہ اس نظام سے وابستہ ہے۔ مساجد و مدارس پر ان حضرات کا قبضہ ہے۔ روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کے چھوٹے چھوٹے اجتماعوں سے لے کر جمعہ و عیدین کے عظیم الشان اجتماعات تک یہی حضرات عوام سے متعلق اور ان سے مخاطب رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے قائم کردہ "ملائی نظام" کی قوت میں حیرت انگیز اضافہ ہو جاتا ہے۔ مکتوب نگار کے الفاظ میں یہ ایک حکومت در حکومت ہے۔

یہ دو ہیں وہ اصل اسباب جن کی وجہ سے "ملا" اس مغرب زدہ اقلیت کی آنکھ میں خار بن کر کھٹک رہا ہے۔

اب دیکھیے کہ جو الزام تراشی "ملا" پر کی جا رہی ہے وہ کس حد تک درست ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ملا حکومت کے ہر ضروری اور مفید پروگرام اور تجویز کو غیر شرعی اور غیر اسلامی قرار دے کر عوام کو اس کے خلاف اکساتا ہے۔ مگر جب ہم "ملا" کے طرزِ عمل کا غیر جانبداری سے جائزہ لیتے ہیں تو ہم اسے اس الزام سے بالکل بری الذمہ پاتے ہیں بلکہ ہمیں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ ملا ہر مفید پروگرام کی دل و جان سے حمایت کرتا ہے اور بغیر کسی طمع اور لالچ کے اسے کامیاب بنانے میں حکومت کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد حکومت نے سینکڑوں نئے منصوبے بنائے ہیں اور ان کی تکمیل پر کروڑوں روپے صرف کیے ہیں۔ مگر ملا نے ان کے خلاف کبھی ایک لفظ تک نہیں کہا۔ لاتعداد پُلوں اور بندوں کی تعمیر، ہزاروں نہیں لاکھوں ٹیوب ویلوں کی تنصیب، فوج کی تعداد میں معتدبہ اضافہ اور اسے جدید ترین آلاتِ حرب سے مسلح کرنے کی مختلف تجاویز، نئے نئے ہسپتالوں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام کے متعدد منصوبوں میں آخر وہ کونسا ایسا منصوبہ ہے جس کی "ملا" نے کبھی مخالفت کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو؟ ہماری نظر سے آج تک سرکاری اور غیر سرکاری اخبار کے کسی کالم میں کوئی ایسی خبر نہیں گزری جس میں "ملا" نے ان پروگراموں پر بیزاری کا اظہار کیا ہو۔ یہاں بڑے بڑے شہروں کے اطراف میں اضافی بستیاں قائم کی گئیں طبیعی علوم کی تحقیق کے لیے مختلف مقامات پر معمل اور تجربہ گاہوں کا قیام عمل میں لایا گیا، مگر "تنگ نظر ملا" کی زبان سے شکایت کا ایک لفظ سننے میں نہیں آیا۔ بلکہ ہم نے تو "ملا" کو ان معاملات میں "مسٹر" سے کہیں زیادہ وسیع الظرف اور عالی حوصلہ پایا ہے۔ "مسٹر" نے اقتدار کے بل بوتے پر جدید طب وجراحت کی عملداری قائم کرنے کے ساتھ اس امر کی پوری کوشش کی کہ طب اسلامی نہ صرف حکومت کی تائید سے یکسر محروم ہو جائے بلکہ اُس کے لیے زندہ رہنا بھی ناممکن بنا دیا جائے۔ مگر "ملا" نے اِس بے جا تعصب اور صریح زیادتی کو محض اس بنا پر خاموشی کے ساتھ برداشت کیا کہ طب جدید کے علمبردار خواہ طب اسلامی کے کتنے ہی مخالف ہوں مگر چونکہ جدید انکشافات کی وجہ سے یہ طریق علاج بعض پہلوؤں سے زیادہ موثر اور کارآمد ہے اس لیے اسے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا ضرور موقع دیا جانا چاہیے۔ یہاں کتنے سکول اور کالج نوخیز نسلوں کو مغربی تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور اُن پر خزانہ سرکار کی اس آمدنی کا کروڑوں روپیہ صرف ہو رہا ہے جس کی فراہمی میں "ملا" کا حصہ بھی ہے۔ "ملا" نے اس پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ مگر اس کے مقابلے میں عالی ظرف "مسٹر" کو یہ بات بھی گوارا نہیں ہے کہ "ملا" حکومت کے خزانے پر ایک پائی کا بوجھ ڈالے بغیر صرف عوام کے چندوں سے دینی تعلیم کی ترویج کا انتظام کرے اور روکھی سوکھی کھا کر دینی مدرسے چلائے۔ اور اس کو بند کرنے کے لیے بھی جو طریقہ یہ لوگ تجویز کرتے ہیں وہ یہ نہیں ہے کہ دلائل سے اپنی قوم کو ان مدرسوں کی عدم افادیت کا قائل کر دیں بلکہ یہ بلند حوصلہ لوگ صدر ایوب سے کہتے ہیں کہ آپ طاقت استعمال کر کے ان کا خاتمہ کر دیں۔

ان حقائق اور شواہد کی موجودگی میں یہ کہنا کہ "ملا" حکومت کے ہر مفید اور ضروری پروگرام کی مخالفت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے ایک بالکل بے بنیاد الزام ہے۔ ان مغرب زدہ حضرات نے "ملا" کی جو فرضی تصویر کشی کی ہے اُس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ملا" کو اگر کوئی دنیا میں کام ہے تو وہ صرف یہی کہ وہ ہر معقول بات کو غیر شرعی اور غیر اسلامی کہہ کر عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرتا رہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر حالات کے مشاہدے سے "ملا" کے انداز فکر کا جو رُخ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ جب کسی بات کو صریحًا شریعت کی رُو سے غلط سمجھتا ہے تو اُسے غلط کہتا ہے اور جب اُسے کسی درجہ میں بھی شرعًا صحیح سمجھتا ہے تو اُس کی تائید کرتا ہے "ملا" کتنا حقیقت پسند ہے اس کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں، صرف تعصب کو بالائے طاق رکھ کر حالات کا مطالعہ حقیقت کو پوری طرح منکشف کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف فوج کے بارے میں ملا کے طرزِ عمل کو دیکھیے۔ پاکستان کے قیام سے پہلے ملا انگریزی فوج میں ملازمت کو پوری قوت اور جرأت کے ساتھ حرام کہتا رہا اور حق گوئی کی پاداش میں اُس نے بڑی بڑی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ کیونکہ اُس کے سامنے ہادیٔ برحق کا یہ فرمان تھا کہ جو شخص کفر کے جھنڈے کے تحت یا اُس کی سربلندی کے لیے مرا اُس نے جاہلیت کی موت پائی۔ مگر جس روز پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور انگریز کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی، اُسی وقت سے اُس نے فوج کی ملازمت کو نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ اس کی خدمت کو بہت بڑی نیکی سے تعبیر کیا۔ فوج کو بڑھانے، اُسے ترتیب دینے اور اُسے جدید ترین اسلحہ سے مسلح کرنے کے بارے میں اُس نے حکومت کی ہمیشہ دل و جان سے تائید و حمایت کی۔

یہ معاملہ خود اس ملک کے سوچنے سمجھنے والے دماغوں کی توجہ کا طالب ہے کہ آخر یہ "ملا" جب سینکڑوں منصوبوں اور پروگراموں کی حمایت کرتا ہے تو خاندانی منصوبہ بندی، عائلی قوانین، سودی نظام، رقص و سرود کی ثقافت، شراب نوشی، قمار بازی، مخلوط تعلیم اور اسی نوعیت کے دوسرے کاموں پر کیوں تنقید کرتا ہے اور ان معاملات میں کیوں حکومت کی تائید نہیں کرتا۔ اس کی وجہ ملک کا مغرب زدہ طبقہ اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ محض تجاہلِ عارفانہ کے طور پر "ملا" کے اس طرزِ عمل پر حیرانی کا اظہار کرتا ہے۔ مگر اس میں نہ تو حیرانی کی کوئی بات ہے اور نہ کوئی ایسی پیچیدگی کہ حقیقت سمجھ میں نہ آتی ہو یا نہ آ سکتی ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ ملک کے مغرب زدہ طبقے کے نزدیک اچھائی اور برائی کا معیار یورپ اور امریکہ ہے۔ وہ زندگی کے تمام معاملات کا جائزہ مغربی اقدارِ حیات کے نقطۂ نظر سے لیتا ہے اور پھر ان کے مطابق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر کام کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ وہ خواہ زبان سے یہ بات نہ کہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اُس کے نزدیک کوئی رہنما ضابطۂ حیات نہیں ہے۔ یہ جس حد تک مغربی تہذیب و تمدن کے ساتھ ہم رکاب ہو کر چل سکے اُس حد تک تو گوارا ہے اور جس مقام پر ان دونوں کے راستے مختلف ہوں وہاں سے مغرب زدہ طبقہ اُسے چھوڑ کر مغرب کی پیروی اختیار کرتا ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے اس طرزِ عمل پر وہ عوام میں ہدفِ ملامت نہ بنے، اس لیے اسلام کو اپنے پیچھے گھسیٹنے کی مذموم کوشش کرتا ہے اور اس کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریات کے مطابق ڈھالتا ہے۔ پھر جب دین کا علم رکھنے والے اس پر ٹوکتے ہیں اور نا قابلِ انکار دلائل سے ان کی من مانی تاویلات و تعبیرات کی غلطی واضح کرتے ہیں تو یہ جبر سے کام لے کر ان کو دباتا ہے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کہتا ہے کہ اسلام کی تعبیر کا حق کوئی ملّا کی میراث تو نہیں ہے۔

اسلام کی تعبیر بلاشبہ "ملّا" کی اجارہ داری نہیں مگر اس تعبیر کے لیے علم و واقفیت اور فکر و عمل کی اہلیت تو درکار ہے۔ دنیا میں کونسا ایسا علم و فن ہے جس میں ہر کس و ناکس کو اس کا ضروری علم حاصل کیے بغیر تعبیر کا حق دے دیا جاتا ہے۔ کیا فوج کے معاملات میں کسی ایسے شخص کو بولنے کا حق دے دیا جائیگا جو فوجی تنظیم و ترتیب اور فنِ حرب سے کوئی واقفیت نہ رکھتا ہو؟ کیا قانون کے معاملات میں غیر قانون دان، اور ڈاکٹری کے معاملات میں غیر ڈاکٹر، یا مالیات کے مسائل میں عام راہ چلتے کی رائے کو کوئی وزن دیا جائے گا؟ پھر دین کے معاملے میں ان لوگوں کی رائے کیسے وقیع ہو سکتی ہے جو نہ دین کا علم رکھتے ہیں نہ اس کے مطابق عمل کرتے نظر آتے ہیں؟ دین کی تعبیر کے لیے اہلیت کی اوّلین شرط یہ ہے کہ آدمی قرآن و سنت کا اتنا علم رکھتا ہو کہ وقت کے پیش آمدہ مسائل میں خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کر سکے۔ اور دوسری اتنی ہی اہم شرط یہ ہے کہ وہ عملاً اسلام کی پیروی کرنے والا ہو اور اس پر خود اس کی زندگی گواہی دے رہی ہو۔ جن لوگوں میں یہ دونوں ہی شرطیں مفقود ہوں، جنہوں نے اسلام کو جاننے اور سمجھنے میں اپنی عمرِ عزیز کا ہزارواں حصہ بھی نہ صرف کیا ہو، اور جو اپنی عملی زندگی میں فرائض تک کے پابند نہ ہوں، ان کا یہ حق آخر کیسے مانا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام کی تعبیر کریں اور لوگ اسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے چون وچرا مان لیں؟ ظاہر بات ہے کہ اسلام کی تعبیر کا مقصد وقت کے تقاضوں کو اسلام کے مطابق ڈھالنا ہے نہ کہ اسلام کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا۔ جو لوگ سیدھے چارے خود وقت کے تقاضوں میں ڈھلے ہوئے ہیں، اور صرف وقت کے ان تقاضوں ہی کو جانتے ہیں، اسلام کی الف ب تک نہیں جانتے، ان کے متعلق کوئی بگڑے سے بگڑا مسلمان بھی یہ نہیں مان سکتا کہ وہ اسلام کی صحیح تعبیر کرنے کے اہل ہیں۔ "عوام کالانعام" تو درکنار، اگر اس ملک کے صرف گریجویٹوں اور پوسٹ گریجویٹوں کی رائے بھی کسی ریفرنڈم کے ذریعہ سے معلوم کی جائے تو ان کی کم از کم ۹۰ فی صد تعداد اس مغرب زدہ طبقے کو اسلام کے معاملہ میں اتھارٹی ماننے سے انکار کر دے گی۔

اس مغرب زدہ طبقے کی تعبیرات کا انداز کتنا غلط اور ان کے مزاج میں کتنی مرعوبیت ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دین کے کسی معاملے میں ان کی کوئی تعبیر ایسی نہیں جس میں مغربی تہذیب کی جھلک نہ دکھائی دیتی ہو۔ اگر یہ تعبیر واقعی اسلام ہی کی تشریح و توضیح کے طور پر ہوتی اور زندگی کے معاملات پر احکام شریعت ہی کو صحیح طریقے سے منطبق کرنے کے لیے کی جاتی تو آخر کہیں تو ان کی تعبیرات مغربی معیارِ تمدن و تہذیب کے خلاف بھی ہوتیں، کیونکہ مغرب نہ سراپا حق ہے اور نہ ہو بہو اسلام ہے۔ اس لیے اسلام کی صحیح تعبیرات کا متعدد مقامات پر مغرب سے متصادم ہونا بالکل فطری بات ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان حضرات کے نظریات کسی ایک مقام پر بھی مغرب سے مختلف نہیں ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ کسی دینی مسئلہ کی تعبیر کرتے ہوئے ان کا ذہن مغرب کے سوا کسی دوسری طرف مائل ہی نہیں ہوتا؟ سود، ضبطِ ولادت، پردہ، مخلوط تعلیم، عائلی قوانین، اور اسی نوعیت کے بیسیوں دوسرے مسائل میں مغرب ہی کو معیارِ حق سمجھ کر احکامِ شریعت کی تحریف کی جاتی ہے مگر نام اُسے تعبیر کا دیا جاتا ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ زندگی کے بعض معاملات میں جہاں شارع نے قطعی اور واضح احکام نہیں دیئے ہیں، تعبیر اور تشریح کی گنجائش ہے۔ ہمیں وقت کے تقاضوں اور ان کی قوت اور اہمیت سے بھی انکار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہے۔ مگر یہ بات سمجھنے سے ہم قاصر ہیں کہ جو تقاضے مغرب کے ہیں اُن کے علاوہ بنی نوع کے اور کوئی تقاضے نہیں اور حسن و قبح کا جو معیار مغرب نے مقرر کیا ہے اُس کے سوا کوئی دوسرا معیار نہیں۔ ہمارے ہاں فقہاء نے بعض مسائل کی کتنی ہی مختلف تعبیرات پیش کی ہیں اور اُن کے درمیان اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی ایک تعبیر کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جو ذہنی مرعوبیت کا نتیجہ ہو اور پھر اُسے امت نے قبول بھی کر لیا ہو۔ آج شراب اور سود کو حلال کرنے کے لیے جو دُور از کار دلائل دیئے جاتے ہیں اور اس معاملے میں ایڑی چوٹی کا جو زور صرف کیا جاتا ہے وہ صرف اس لیے کہ اس دور کی غالب تہذیب میں ان دونوں برائیوں کا عام رواج ہے۔ یہ برائیاں کوئی نئی تو نہیں۔ بگڑے ہوئے لوگ ہر زمانے میں ان کا ارتکاب کرتے رہے ہیں۔ مگر آج تک کسی مسلمان مفتی نے جسے فی الواقع امت نے مفتی مانا ہو، انہیں جائز قرار دینے کی جرأت نہیں کی۔ کیا ان صلحاء امت پر حالات کا کوئی دباؤ نہ تھا؟

"ملا" جس وجہ سے گردن زدنی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب سے مرعوب نہیں ہے اور ذہنی غلامی کا قلادہ اس نے اپنی گردن میں نہیں ڈالا ہے۔ وہ تنگ نظر اور متعصب نہیں ہے کہ آپ مغرب سے واقعی کوئی مفید چیز لائیں اور وہ خواہ مخواہ اس کی مخالفت کرے۔ وہ اگر برسرِ اقتدار طبقے کے کسی اقدام پر ٹوکتا ہے تو صرف اس لیے کہ اُسے اقدار کا وہ سارا نظام درہم برہم ہوتا نظر آتا ہے جس سے دینِ حق عبارت ہے۔ سارا فرق زاویۂ نگاہ کا ہے۔ مغرب زدہ طبقہ مادی تہذیب کے زیر اثر جن باتوں کو انتہائی ضروری سمجھتا ہے اُن میں سے بہت سی باتیں "ملا" کی نظر میں غیر ضروری، اسلام سے متصادم، اور فی الحقیقت مفید ہونے کے بجائے اُلٹی نقصان دہ ہیں۔ ہم وضاحت کے لیے اُن دو مسائل کو لیتے ہیں جن کی طرف مکتوب نگار نے خاص طور پر اشارہ کیا ہے، یعنی "ملا" نے خاندانی منصوبہ بندی اور "عائلی اصلاحات" جیسے مفید منصوبوں کو غیر شرعی قرار دے کر انہیں عوام میں نامقبول بنانے کی کوشش کی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مکتوب نگار کے نزدیک یہ "ملّا" کی حماقت اور جہالت ہے کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت کرتا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ دین سے ملّا کی واقفیت ہی کی نہیں بلکہ اس کی عاقبت اندیشی، فرض شناسی اور حالات سے گہری واقفیت کی دلیل بھی ہے۔ وہ دین کے مزاج کو اچھی طرح سمجھنے کی وجہ سے اس بات کو جانتا ہے کہ مسلم معاشرے میں اخلاق کی اہمیت ہر دوسری چیز سے زیادہ ہے۔ غربت اور افلاس اُس کے نزدیک بھی کوئی پسندیدہ چیزیں نہیں ہیں۔ وہ بھی اس بات کا خواہاں ہے کہ عوام کی بنیادی ضروریات بطریقِ احسن پوری ہوں، اور سوسائٹی کے ہر فرد کو آرام اور سکون میسر ہو۔ مگر وہ کبھی اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ غربت کو دُور کرنے کے لیے کوئی ایسا ذریعہ اختیار کیا جائے جس سے معاشرے میں فحاشی پھیلنے لگے۔ افلاس کو دُور کرنے کے لیے بہت سی تدابیر ممکن ہیں جنہیں حکومت کو اختیار کرنا چاہیے۔ آخر یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ جب تک خاندانی منصوبہ بندی کا عام رواج نہ ہو اس وقت تک اس مرض کا علاج ناممکن ہے؟ صرف "ملّا" ہی نہیں، مغرب زدہ طبقہ بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ مغربی ممالک میں جب اس کا رواج ہوا تو اباحیت کا ایک ایسا خوفناک طوفان اٹھا جس نے اہلِ مغرب کی ساری اخلاقی قدروں کو برباد کر کے رکھ دیا۔ "ملّا" کے نزدیک اخلاق کی یہ اقدار مادی خوشحالی سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں اس لیے وہ ہر قیمت پر ان کی محافظت و پاسبانی کرنا چاہتا ہے۔ علاوہ بریں معاشی اور تمدنی حیثیت سے بھی خاندانی منصوبہ بندی کی پوری اسکیم معاشرے کے لیے سخت نقصان دہ ہے جس کے دلائل پوری تفصیل کے ساتھ "اسلام اور ضبطِ ولادت" میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ مگر یہ مغرب زدہ طبقہ دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اس کے پاس دلیل کا جواب صرف طاقت ہے۔

ہر نظامِ حیات اقدار کا اپنا ایک الگ اور منفرد ڈھانچہ رکھتا ہے جو اسے دوسرے نظاموں سے ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔ یہ اقدار اُس نظام کے مختلف شعبوں کے مابین نہ صرف ربط قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہیں بلکہ اُس کی اہمیت متعین کرنے کا پیمانہ بھی ہوتی ہیں۔ مغربی معاشرے میں جو چیزیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پسندیدہ ہیں، ضروری نہیں کہ مسلم معاشرے میں بھی وہ قابلِ قدر ہوں۔ جب دونوں معاشرے مقاصدِ حیات اور اصول اور مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو لامحالہ اُن کے سوچنے سمجھنے کے انداز، اُن کے اخلاقی معیارات، اُن کے خوب و ناخوب کے پیمانوں میں بھی فرق ہونا چاہیے۔ عائلی قوانین، جن کو یہ لوگ عائلی ”اصلاحات“ کہتے ہیں اور جنہیں نافذ کر کے داد طلب نگاہوں سے اہلِ مغرب کی طرف دیکھتے ہیں، ان کا بنیادی نقص یہی ہے کہ ان میں نکاح و طلاق کے متعلق مغربی نظریات کو لا کر خواہ مخواہ اسلامی قانون میں ٹھونس دیا گیا ہے، اور اپنی جگہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ ایک ”اصلاح“ ہے جو اسلامی قانون میں کی گئی ہے۔ ”ملّا“ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں مغرب کی اندھی پیروی کے بجائے اسلامی شریعت کے اصول، احکام اور مقاصد کو سامنے رکھتا ہے جو اُمتِ مُسلمہ کے پیشِ نظر ہونے چاہییں اور حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کے درمیان اسلام نے جو تناسب قائم کر رکھا ہے اس میں خلل اندازی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اسلامی شریعت ”اصلاح طلب“ ہے اور اس کے اندر مغربی نظریات کے مطابق اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

”ملّا“ بیچارے پر یہ الزام بھی ہے کہ اس نے ملک میں حکومت در حکومت قائم کر رکھی ہے۔ اس حکومت در حکومت کا آخر مطلب کیا ہے؟ جو طبقہ یہ الزام لگا رہا ہے، اقتدار بالکلیہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ فوج، پولیس، ملکی نظم و نسق، سب اس کے قبضے میں ہے۔ ملک کی معاشی زندگی پر اس کا کنٹرول ہمہ گیری کے ساتھ قائم ہے۔ قانون سازی کی پوری مشینری، بنیادی جمہوریتوں سے لے کر اسمبلیوں تک اس کی گرفت میں ہے۔ پریس اور پلیٹ فارم، دونوں کو اس نے مکمل طور پر اپنے قابو میں لے رکھا ہے۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد اب باقی کیا رہ گیا ہے جہاں ”ملّا“ نے حکومت در حکومت قائم کر رکھی ہے؟ باقی صرف یہ رہ گیا ہے کہ ابھی قوم کا ضمیر زندہ ہے، اس میں کچھ لوگ غلط کو غلط کہنے والے موجود ہیں، اور قوم اس حد تک غلام نہیں بنی ہے کہ ہر آواز جو اقتدار کے مرکز سے اٹھے اس پر بے چون و چرا آمنّا و صدقنا کہہ دے۔ اس چیز کو ”حکومت در حکومت“ کا نام دے کر خطرے کی گھنٹیاں بجائی جا رہی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ پوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوم کو اقتدار کے آگے سربسجود ہونا چاہیے۔ اگر ایک زبان بھی اقتدار کی کسی بات کو غلط کہنے والی اور ایک کان بھی اس کو سننے والا موجود ہے تو یہ "حکومت در حکومت" ہے جسے ختم کیے بغیر وحدہٗ لاشریک حکومت کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔

جن حالات اور جن مقاصد کے تحت اس ملک میں مارشل لا نافذ کیا گیا وہ سب کے سامنے ہیں۔ قوم کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے اور اُسے معائب سے پاک کرنے کے لیے یہ وہ انتہائی قدم تھا جو اٹھایا گیا۔ اس سے ملک کے سارے اختیارات ایک ذات میں منتقل ہو گئے۔ اُسے اس بات کی پوری آزادی دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے قوم کی بگڑی سنوارے۔ قریب قریب دس سال بلاشرکت غیرے حکمرانی کرنے کے بعد اب جو نتائج سامنے آ رہے ہیں وہ قوم کی امیدوں سے بہت کم ہیں۔ اتنے غیر معمولی ایثار کے بعد قوم بہتر ثمرات کی توقع رکھتی تھی۔ اس چیز نے اُس کے اندر افسردگی پیدا کر دی ہے۔ ان حالات میں انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ کامیابیوں اور ناکامیوں کا بے لاگ جائزہ لیا جاتا اور جہاں جہاں معاملات کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے میں غلطی سرزد ہوتی تھی اس کا برملا اعتراف کیا جاتا اور پوری قوم کو اعتماد میں لیکر اُس کے تدارک کی فکر کی جاتی۔ مگر یہاں کیا یہ جا رہا ہے کہ ناکامیوں کا سارا غصہ غریب "ملّا" پر نکال کر عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ سب کچھ اسی کم بخت کی مخالفت کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ راستے میں حائل نہ ہوتا تو بڑے مفید نتائج برآمد ہوتے۔ سوچنے کا یہ انداز کسی حقیقت پسند اور حق شناس انسان یا گروہ کو زیب نہیں دیتا۔ آپ خاندانی منصوبہ بندی کے اس پروگرام کو ہی دیکھیے۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ۲۴ کروڑ روپے کی خطیر رقم مختص کی گئی اور اس کا پرچار کرنے اور اس کی عملی تعلیم دینے کے لیے ڈاکٹروں، نرسوں اور دوسرے کارندوں کی ایک فوج میدان میں لا کر ڈال دی گئی۔ اخبارات میں اس "مفید پروگرام" کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ پروگرام شادی شدہ جوڑوں میں مقبول ہونے کے بجائے غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں میں مقبول ہوا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ شادی شدہ افراد غیر شادی شدہ لوگوں کی بہ نسبت "ملّا" کے زیادہ زیر اثر ہیں؟ انہیں خود اپنی فلاح و بہبود کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی احساس نہیں کہ ایک "مفید" چیز کو قبول نہیں کرتے؟ ملّا کی اس وقت جو حالت ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ بے زر، بے زور اور بے یار و مددگار طبقہ حکومت کے عزائم کو ناکام بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔ درحقیقت خاندانی منصوبہ بندی کا یہ پروگرام ملّا کی مخالفت کی وجہ سے ناکام نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی ناکامی کی بڑی وجہ قوم کے مزاج سے عدم واقفیت اور اس کے دینی احساسات سے ناآشنائی ہے۔ اور جہاں یہ کامیاب ہو رہا ہے (یعنی غیر شادی شدہ لوگ) وہاں یہ ملّا کی مخالفت کے باوجود خوب کامیاب ہو رہا ہے، کیونکہ اس کی پشت پر نفسیاتی اسباب کام کر رہے ہیں۔

"ملّا" کو حکومت در حکومت کے قیام کا اس بنا پر بھی مجرم ٹھیرایا گیا ہے کہ اس نے اپنا ایک الگ نظامِ تعلیم رائج کر رکھا ہے جو اسے قوت و اقتدار بہم پہنچاتا ہے۔ اس نظام کے تحت ایک ہزار برس قبل کا مرتب کردہ "ایک دقیانوسی فرسودہ اور علمی لحاظ سے افلاس زدہ نصاب" پڑھایا جاتا ہے جس کے تمام علوم قیاسی اور ظنی ہیں، کیونکہ ان کی بنیاد ارسطو کی منطق استخراجیہ پر رکھی گئی ہے اور مسلم حکماء کے تحقیق کردہ اصول استقراء کو اس میں جگہ نہیں دی گئی۔ اس ضمن میں صدرِ مملکت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ ان سب مدارس کو ختم کر کے محکمہ اوقاف کے زیرِ نگرانی ایسے دارالعلوموں کا قیام عمل میں لایا جائے جن میں عصرِ حاضر کے تقاضوں اور علوم سے باخبر مذہبی رہنما تیار کیے جائیں تاکہ امتِ مسلمہ میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کا درس دینے والے سیاسی طالع آزماؤں" کی تخلیق بند ہو جائے۔

حکومت کو یہ مشورہ بھی اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تعلیم و تربیت کا پورا نظام براہِ راست اس کی تحویل میں چلا جائے اور کوئی آزاد تعلیمی نظام باقی نہ رہنے دیا جائے تاکہ ایک کامل ہمہ گیر ریاست (TOTALITARIAN STATE) کے مقاصد اچھی طرح پورے ہو سکیں۔ یہ کام فکر و نظر کو جلا دینے کے لیے نہیں بلکہ افکار و جذبات کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لیے درکار ہے۔ اس مغرب زدہ طبقے کو اپنی روشن خیالی پر بڑا فخر و ناز ہے مگر وہ اس سادہ سی حقیقت کو بھی جاننے سے قاصر ہے کہ جو قوم اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور ان کی تخلیقی قوتوں کو ابھارنے کا داعیہ رکھتی ہو وہ شعور و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احساس کو زیادہ سے زیادہ آزاد فضا مہیا کر کے اُسے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ نظام تعلیم پر حکومت کی مکمل اجارہ داری کو کبھی کسی ہوشمند قوم نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر فکری اور جذباتی اعتبار سے انسانوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا جائے اور کسی وجہ سے اس مخصوص فکر اور احساس کو زوال آجائے تو قوم کے احیاء کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی دانشمند قومیں اپنے ہاں ہر قسم کے نظامِ تعلیم کو، بشرطیکہ وہ اُس کے اساسی تخیل کو برباد کرنے والا نہ ہو، نہ صرف برداشت کرتی ہیں بلکہ اُس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے حکومت کے اثر سے بالکل آزاد ہیں اور وہ اپنے نہج پر نوخیز نسلوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے ہیں۔ ان اداروں کی بیشتر تعداد ایسی ہے جنہیں کلیسا، معابد، یا مذہبی تنظیمیں بڑی کامیابی کے ساتھ چلاتی ہیں۔ ان تعلیمی مراکز کو باشعور قومیں اپنے ہاں کے نخلستان سمجھتی ہیں جن میں انسان کو آزادی اور سکون کا ماحول نصیب ہوتا ہے۔ آکسفورڈ نے اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے جتنی قربانی اور جرأت کا ثبوت دیا ہے وہ کسی صاحب علم سے پوشیدہ نہیں۔ تعلیمی جکڑبندیاں تو دورِ جدید کے آمرانہ رجحانات کے شاخسانے ہیں۔

مذہبی مدارس اور دارالعلوموں میں مروجہ نصاب کا ذکر مغرب زدہ طبقہ جس نفرت اور حقارت سے کرتا ہے اُس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اس طبقے کے اکثر و بیشتر افراد نے اس نصاب کو باقاعدہ پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ دقیانوسی، فرسودہ اور علمی لحاظ سے افلاس زدہ ہے۔ ہم پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اس طبقہ کا یہ دعویٰ اس نصاب کے بارے میں یکسر بے خبری پر مبنی ہے۔ وہ اس نصاب کی ابجد تک بھی نہیں جانتا اور یونہی اس کے بارے میں بے سروپا باتیں کرتا رہتا ہے۔

یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ ہر قدیم چیز فرسودہ اور ہر پُرانا نظریہ بیکار ہے۔ حکمت اور دانائی کی بات جس طرح کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہیں بالکل اسی طرح یہ کسی خاص عہد کی بھی میراث نہیں۔ پرانے زمانے میں بھی اہلِ علم نے بعض ایسے افکار اور ایسی تخلیقات پیش کی ہیں جو آج بھی علم و حکمت کی اساس تصور کی جاتی ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈرامے، چاسر، ملٹن، پوپ اور ڈرائیڈن کی نظمیں آج بھی انگریزی ادب کا سب سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیش قیمت سرمایہ ہیں اور کوئی شخص ان سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کیے بغیر انگریزی زبان اور ادب کی نزاکتوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ اسی طرح فلسفے اور سیاسیات میں آج بھی افلاطون اور ارسطو کے نظریات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ پورے یورپی ادب اور حکمت کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا سرچشمہ یونان کے قدیم مفکرین کے تصورات ہیں۔ "روشن خیال یورپ" تو انہیں اپنے نصاب میں بطور بنیاد شامل کر کے نوخیز نسلوں کے دل و دماغ پر ان کے نقوش مرتسم کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے، مگر ہم کسی قدیم بات کے محض اس لیے دشمن ہیں کہ اس کا تعلق ماضی سے ہے۔ اس طرزِ فکر کا اصل محرک یہ نہیں ہے کہ ہمارے قدیم علوم فرسودہ ہیں بلکہ اس کا اصل مقصود نوجوانوں کے ذہن میں ماضی کے خلاف نفرت پیدا کر کے اُس سے اُن کا فکری اور جذباتی رشتہ کاٹ دینا ہے۔ مغربی یونیورسٹیوں میں اگر شیکسپیئر اور ملٹن کی کتابیں داخلِ نصاب ہوں اور افلاطون اور ارسطو کے خیالات سے طلبا کو پوری طرح آشنا کرنے کا انتظام ہو تو یہ روشن خیالی اور عقل پسندی ہے، لیکن اگر عربی مدارس میں جلالین، بیضاوی، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، نسائی، ہدایہ، دیوان حماسہ، دیوان متنبی اور مقامات حریری پڑھانے کا انتظام ہو تو یہ سراسر جہالت ہے!

جو شخص تعلیمی مسائل کی معمولی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے وہ اس بات سے واقف ہے کہ نصاب کی ترتیب میں صرف یہ چیز پیشِ نظر رکھی جاتی ہے کہ ایسی کتابیں درساً پڑھائی جائیں جو طلبا کے اندر ٹھوس علمی استعداد پیدا کر کے انہیں خود اعتمادی کے ساتھ مزید تحقیق کے لیے تیار کر سکیں۔ مجھے قدیم اور جدید دونوں مدارس میں تھوڑی مدت پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ درسِ نظامی کا نصاب ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرنے کے اعتبار سے جدید مدارس کے نصاب سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اس نصاب کو اگر اچھے طریقے سے پڑھایا جائے تو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کو سمجھنے کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں اور وہ پھر اُس طرح کی ٹھوکریں نہیں کھاتا جو آج کے متجددین بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے اور لمبی چوڑی تحقیقات کے دعووں کے باوجود اکثر و بیشتر کھاتے رہتے ہیں۔ جن باتوں کو یہ حضرات چند فقہی اور

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

© rasailojaraid.com